لارنس آف تھلیپیا

پلنگ اتنا چوڑا تھا کہ اس پر جو کھیس بچھا تھا وہ چار کھیسوں کے برابر تھا۔ اس کے وسط میں پلش کے ایک گاؤ تکیے کے سہارے بڑے ملک صاحب کے جسم کا ڈھیر پڑا تھا۔ ان کی انگلیوں، انگوٹھوں، پنڈلیوں، رانوں، کمر، پیٹھ، کندھوں اور سر کو بہت سے میراثی، نائی، جھیور، دھوبی، موچی، کمہار اور کسان دبا رہے تھے۔ میں ذرا دور بیٹھا تھا اس لیے وہاں سے مجھے یہ منظر یوں دکھائی دے رہا تھا جیسے ایک بڑے سے غبارے کو ہوا میں اُڑ جانے سے روکنے کے لیے اس کے ساتھ بہت سے بچے چمٹ کر رہ گئے ہوں۔ پھر خدا بخش نے چوپال میں قدم رکھا تو بڑے ملک صاحب بولے:

''آج چھوٹا ملک بہت خوش ہے۔ آج اس کا یار آیا ہے لاہور سے۔'' انہوں نے ایک لمبی کانکھ کے ساتھ پلٹ کر میری طرف دیکھنے کی اور شاید مسکرانے کی بھی کوشش کی مگر یہ مسکراہٹ مجھ تک نہ پہنچ سکی۔ ان کے سُوجے ہوئے گالوں اور گھنے گل مچھوں سے ٹکریں مار کر وہیں کہیں مر گئی۔

میں دُور اس لیے بیٹھا تھا کہ میرے لیے چائے آنے والی تھی۔ بشکو چوپال کے برآمدے کے آخری سرے پر دو کرسیاں اور ایک تپائی رکھ کر اور مجھے ایک کرسی پر بٹھا کر خدا بخش کو بلانے اور چائے لانے چلا گیا تھا۔ بشکو، خدا بخش کا بہت چہیتا نوکر تھا۔ نام تو اس کا بھی خدا بخش تھا مگر خدا بخش اسے بشکو کہتا تھا، چنانچہ یہی اس کا نام پڑ گیا تھا۔

خدا بخش کی امی کو نزلے، زکام اور بخار کی شکایت تھی، اس لیے وہ بار بار اندر حویلی کا چکر لگا آتا تھا۔ اب کے وہ واپس آیا تو میرے سامنے کرسی پر بیٹھ گیا اور مجھے بتایا کہ اس کی امی کا

بخار اب ہلکا ہے اور وہ آرام کر رہی ہیں۔ ''ان کا بخار تیز رہتا تو آج تمہیں باز کے شکار کا تماشا نہ دکھا سکتا۔'' وہ بولا۔ ''لارنس آف عربیا کی طرز پر میں نے اپنے باز کا نام لارنس آف تھیلیبیا رکھ لیا ہے۔ تھل کو تھلیبیا میں بدلنے پر تمہیں کوئی اعتراض تو نہیں؟'' وہ ہنسا۔ ''ابھی چائے کے بعد تم، میں اور بشکو گاؤں سے باہر نکل جائیں گے۔ بشکو میرے باز کا سائیس ہے۔'' وہ پھر ہنسا۔ ''یوں سمجھ لو کہ وہ لارنس آف تھلیبیا کا اردلی ہے۔ وہ باز کو اپنی مُٹھی پر بٹھائے گا اور۔۔۔۔۔۔''

دھم دھم کی آواز سے ہم چونکے۔ دیکھا تو دو آدمیوں نے ایک اور آدمی کو پکڑ کے بڑے ملک کے سامنے جُھکا رکھا تھا اور ملک صاحب اس کی پیٹھ پر مُکّوں کا مینہ برسا رہے تھے اور ساتھ ہی ایسی گالیاں بھی دیتے جاتے تھے جو صرف بڑے ملک صاحب ہی کسی کو دے سکتے ہیں۔ ساتھ ہی وہ ہانپ ہانپ کر کہتے جاتے تھے۔ ''بھری مجلس میں کہتا ہے، ملک جی تہہ بند سنبھالو، ننگے ہو رہے ہو۔۔۔۔ اس حرامزادے سے کوئی پُوچھے کہ تمہیں کیا تکلیف تھی۔ میں ہی ننگا ہو رہا تھا، تمہاری ماں تو ننگی نہیں ہو رہی تھی۔''

خدا بخش نے مسکرا کر میری طرف دیکھا اور بولا ''آ گئی شامت بیچارے کی۔ اب جب تک یہ ہاتھ پیر ڈھیلے نہیں چھوڑ دیتا ابا اسے کوٹتے ہی رہیں گے۔''

خدا بخش کے لہجے میں برتری کا غرور تھا۔ میں نے کہا ''خدا بخش! تمہیں شرم نہیں آتی، تم تو پڑھے لکھے آدمی ہو۔''

خدا بخش نے معذرتی انداز میں کہا ''کیا کریں یار۔۔۔۔ ان لوگوں سے یہی سلوک کیا جائے تو سیدھے رہتے ہیں۔''

اتنے میں بشکو چائے لے آیا۔ طشت کو تپائی پر رکھتے ہوئے اس نے جُھک کر خدا بخش کے کان میں کہا ''یہ سکین ایسا لڑکا تو نہیں چھوٹے ملک! پھر اسے مار کیوں پڑ رہی ہے؟''

''اچھا تو یہ سکین ہے!'' خدا بخش نے بھی حیرت کا اظہار کیا۔ ''اس کے تو منہ میں زبان

ہی نہیں۔۔۔۔۔ پانچ وقت کا نمازی ہے۔ اذان ایسی دیتا ہے کہ چڑیاں مسجد کے میناروں پر اتر آتی ہیں۔ اس نے یہ کیا بک دیا ابا سے!''

بڑے ملک صاحب کے دھموکوں کا تسلسل ٹوٹ گیا۔ سکین ان آدمیوں کے ہاتھوں میں لٹک گیا تھا جنہوں نے اسے بازوؤں سے پکڑ کر ملک صاحب کی آسانی کے لیے ان کے سامنے جھکا رکھا تھا۔

''اب چھوڑ دو اس کمینے کو۔'' ملک صاحب کڑکے اور سکین منہ کے بل پتھر کی طرح گر پڑا۔ ''اٹھا لے جاؤ اپنی اپنی ماؤں کے اس یار کو۔۔۔۔''

ملک صاحب پھر گرجے اور ایک ہجوم کا ہجوم سکین کو اٹھانے یوں بے تابی سے بڑھا جیسے سب لوگ سکین کو اٹھانے کے بہانے ملک صاحب کو پلنگ پر سے اٹھا کر پھینکنے چلے ہیں۔ پھر جو لوگ سب سے پہلے بے حس و حرکت سکین کے پاس پہنچے تھے، اسے اٹھانے کے لیے جُھکے تو جُھکنے والوں میں سے ایک سیدھا ہو گیا اور بڑی تشویش سے بولا ''سکین تو اذان پڑھ رہا ہے۔''

پھر سکین خود ہی اٹھ بیٹھا۔ ادھر ادھر دیکھا۔ پھر جیسے ملک صاحب سے جانے کی اجازت لینے کے لیے بولا: ''سورج تو بہت ڈھل گیا، پیشی کی نماز تو ہو چکی ہو گی؟''

سبھی کو خاموش پا کر وہ اٹھا تو میں نے دیکھا کہ وہ چھ فٹ کا ایک وجیہہ جوان تھا اور جب وہ آہستہ آہستہ قدم اُٹھاتا چوپال کے چبوترے کی سیڑھیاں اُتر کر گلی میں جانے لگا تو مجھے ایسا لگا جیسے گلی میں مسجد کا مینار اتر آیا ہے۔

''آ جاتے ہیں ماں کے یار چوپال پر گپ لڑانے۔'' بڑے ملک صاحب کہہ رہے تھے۔ ''چوپال پر بیٹھنے کی ایک تمیز ہوتی ہے۔ کہنے لگا ملک جی ننگے ہو رہے ہو۔۔۔۔ بھئی میں ننگا ہو رہا ہوں تم دھیان نہ دو۔ انسان دوپہر کے وقت بھی آنکھیں بند کر لے تو اس کے لیے سورج ڈوب جاتا ہے۔ پھر تم آنکھیں پھاڑے میری طرف کیا دیکھ رہے ہو''۔۔۔۔'' ذرا سا رک

کرانہوں نے پلٹنے کی کوشش کرتے ہوئے پوچھا ''کیوں چھوٹے ملک؟ چائے پلا دی اپنے یار کو؟'' جواب کا انتظار کئے بغیر فوراً ہی انہوں نے اپنا دایاں ہاتھ اٹھایا اور بولے۔۔۔۔''لو بھئی اسے دبا دو۔ دُکھنے لگا ہے حرامزادے کی ہڈیاں گوٹ گوٹ کر۔''

''یہ حرام زادہ کون تھا'' میں نے آہستہ آہستہ سے خدا بخش سے پوچھا۔

''اس کا نام سکین ہے۔'' خدا بخش بولا۔''ذات کا جولاہا ہے۔ یہ کھیس جو ابا کے پلنگ پر بچھا ہے اسی نے بُنا ہے۔ بڑا کاریگر آدمی ہے۔ بڑا نیک آدمی ہے مگر بھولا بہت ہے۔ نہ جانے ابا کو ٹوکنے کا حوصلہ کیسے ہوا اس بدنصیب کو! یہ تو بڑا ہی مسکین آدمی ہے۔''

بشکو فوراً بولا ''اس کا اصلی نام مسکین ہے جی۔۔۔۔محمد مسکین۔ سکین سکین تو لوگ اسے ویسے ہی کہتے ہیں جیسے مجھے بشکو بشکو کہتے ہیں۔''

میں نے کہا ''یہاں آ کر معلوم ہوا کہ مسکین جیسے لفظ میں بھی بگڑنے کی گنجائش موجود ہے۔''

''آہستہ بولو یار!'' خدا بخش نے ڈر کر بڑے ملک صاحب کی طرف دیکھا۔ پھر بولا ''انھوں نے سن لیا تو شاید تمہیں تو کچھ نہ کہیں، میری آفت آ جائے گی۔''

''نہیں۔۔۔۔اب کیا آفت آئے گی۔ اب تو ان کا ہاتھ دُکھ رہا ہے۔''

خدا بخش کو میرا لہجہ اچھا نہ لگا۔ اس نے جیسے ملامت بھیجتے ہوئے مجھے دیکھا اور بشکو سے کہا ''اصطبل میں جا کر دیکھو بیگے نے گھوڑے تیار کر لیے ہیں یا نہیں۔ زینیں کس لی ہوں تو تم جا کر لارنس کو اٹھا لاؤ۔ صبح کا بھوکا ہے۔''

بشکو چلا گیا تو خدا بخش میری طرف مڑا۔ ''دیکھو میاں یہاں آج تمہارا پہلا دن ہے اور تم آج ہی طنز کرنے لگے ہو میرے ابا پر۔۔۔۔اس علاقے کا ایک مقولہ ہے کہ سر جتنا بڑا ہوتا ہے درد سر کا رقبہ اتنا ہی پھیلا ہوا ہوتا ہے۔ ابا کو یہ پٹائیاں مجبوراً کرنی پڑتی ہیں۔۔۔۔نہ کریں تو زمیندارہ کیسے چلے۔'' وہ رُک گیا پھر بولا ''تم کیا سوچ رہے ہو؟''

میں نے کہا ''میں سوچ رہا ہوں کہ جس لمبے چوڑے پلنگ پر ملک صاحب تشریف رکھتے ہیں اس کے پائے کتنے بڑے بڑے ہیں۔ میں نے غور سے دیکھا تو وہ لکڑی کے نکلے۔''

حیران ہو کر خدا بخش نے پوچھا ''لکڑی کے نہ ہوتے تو اور کس کے ہوتے؟ تم نے پہلے کیا سمجھا تھا؟''

میں نے کہا ''میں سمجھا یہ پائے نہیں بلکہ پلنگ کے ہر کونے کے نیچے ایک ایک مسکین کھڑا ہے۔''

''گاؤں کی کھلی فضا کا تم پر اُلٹا اثر ہوا ہے۔'' خدا بخش بولا۔''تم چکرا گئے ہو۔''

میں نے اپنی بات جاری رکھی۔''اور خدا بخش! میں نے یہ بھی سوچا ہے کہ اگر یہ چاروں مسکین پلنگ کے چاروں گوشوں کے نیچے سے نکل جائیں تو پلنگ زمین پر آ رہے۔۔۔۔''

''گھوڑے تیار ہیں چھوٹے ملک'' بشکو ہمارے سروں کے اوپر بولا۔

بشکو کے بائیں ہاتھ کی بند مُٹھی پر چمڑے کا دستانہ چڑھا ہوا تھا جس پر لارنس آف تھلیبیا بیٹھا تھا۔ اس کے پنجے میں باریک سی ایک زنجیر تھی جس کا آخری سرا دستانے میں ٹکا ہوا تھا۔ باز کی آنکھوں پر چمڑے کے کھوپے چڑھے ہوئے تھے۔ خدا بخش نے سر اُٹھا کر یہ کھوپے ہٹائے تو میں نے دیکھا کہ باز کی آنکھوں میں بلا کی وحشت تھی۔

''کیوں کیسا ہے میرا باز؟'' خدا بخش نے پوچھا۔

اور میں نے اس کے کان میں کہا ''بازوں کا بڑا ملک معلوم ہوتا ہے۔''

خدا بخش ہنس پڑا مگر یوں ہنسا جیسے نہ ہنستا تو اور کیا کرتا۔ اس نے باز کی آنکھوں پر کھوپے چڑھائے اور ہم لوگ اصطبل کی طرف چلے۔

خدا بخش نے قسمیں کھا کھا کر مجھے یقین دلایا کہ اس نے جو گھوڑا مجھے سواری کے لیے دیا تھا وہ ملک صاحب کے اصطبل کا مسکین ترین گھوڑا تھا۔''اتنا موٹا تازہ گھوڑا مسکین تو نہیں ہو

سکتا۔'' میں نے شبہ ظاہر کیا مگر اس نے مجھے بتایا ''اس کے اندر کا گھوڑا مار دیا گیا ہے۔ اب یہ طبیعت کا بہت غریب گھوڑا ہے۔ اسے موٹا تازہ رکھنا بہت ضروری ہے۔ ضلع کے افسر لوگ جو اِس طرف دورے پر آتے ہیں اچھے سوار نہیں ہوتے۔ ہوتے بھی ہیں تو کاروں میں پھیل پھیل کر بیٹھنے کی عادت پڑی ہوتی ہے اور گھوڑے کی پیٹھ پر چوکس ہو کر بیٹھنا پڑتا ہے۔ سوابّا نے اس کام کے لیے یہ گھوڑا چُنا کہ اس پر افسر سوار ہو تو اس کی افسری کی شان بھی قائم رہے اور یوں بھی نہ ہو کہ لگام کو ذرا سا بھی ڈھیلا پا کر وہ افسر کو اپنی پیٹھ پر سے ریٹائر کر دے۔ چنانچہ اس گھوڑے پر یا تو ڈپٹی کمشنر بیٹھے ہیں یا آج تم بیٹھے ہو۔''

خدا بخش کا گھوڑا بہت منہ زور تھا۔ کنوتیاں اٹھا کر اور نتھنے پُھلا کر وہ جیسے لگام کو چبا کر اُڑ جانا چاہتا تھا مگر خدا بخش اچھا سوار تھا۔ اس نے اپنے گھوڑے کو میرے گھوڑے سے آگے نہ بڑھنے دیا، جس کی کنوتیاں تو اٹھی ہوئی تھیں مگر چل یوں رہا تھا جیسے سسرال کے صحن میں پہلی بار داخل ہوتے ہوئے دلہنیں چلتی ہیں۔

بشکو باز کو ہاتھ پر بٹھائے ہمارے پیچھے پیچھے آ رہا تھا۔ وہ بھاگ بھی نہیں رہا تھا اور چل بھی نہیں رہا تھا۔ بس بین بین کی سی کیفیت میں مبتلا تھا۔

کیکروں کے گنجان ذخیرے کا موڑ کاٹتے ہی حدِ نظر تک پھیلا ہوا ایک چٹیل ویرانہ تھا جس میں کہیں کہیں بہت فاصلے پر کیکر اگے ہوئے تھے مگر یہ کیکر بیمار سے لگتے تھے۔ ان کے قد بہت چھوٹے اور شاخیں بہت ٹیڑھی اور ننگی تھیں۔ ''لالیاں شام سے پہلے انہی اکا دُکا کیکروں پر آ کر بیٹھتی ہیں۔'' خدا بخش نے مجھے بتایا ''اور لالی باز کا من بھاتا کھاجا ہے۔ میرا لارنس لالی کو دیکھتا ہے تو پاگل ہو جاتا ہے۔ لالی کا گوشت میرے لارنس آف تھلیبیا کی دیکی ہے۔''

میں نے کہا ''خدا بخش! لالی تو بڑا ہی معصوم پرندہ ہے۔ یہ تو چڑیا سے بھی زیادہ معصوم ہوتا ہے۔ اس کی پیلی پیلی، کچی کچی باچھیں اس پر کیسا بچپنا سا طاری کئے رکھتی ہیں۔ پھر یہ پرندوں

میں شاید سب سے زیادہ بے ضرر ہے۔ یہ تو نہایت مسکین مخلوق ہے۔ آخر تم لوگوں کو مسکینوں کا خون پینے کا اتنا شوق کیوں ہے؟

خدا بخش بولا ''اگر تمہیں تقریر کرنے کا ایسا ہی شوق ہے تو راستے میں ابھی کوئی ٹیلا آئے گا۔ تم اس پر چڑھ جانا اور اپنی تقریر جھاڑنا۔ میں اور بشکو دست بستہ سُنیں گے مگر ابھی ذرا رُک جاؤ۔ میرے لارنس کو دیکھو، بشکو کی مُٹھی پر کیسے بار بار پھڑ پھڑا جاتا ہے۔ اس نے ویرانے کی بُو سونگھ لی ہے۔''

''لالی'' بشکو سانپ کی طرح پھنکارا اور خدا بخش نے گھوڑا روک لیا۔ میرا گھوڑا تو اس کی دیکھا دیکھی چل رہا تھا۔ چنانچہ وہ بھی رک گیا۔ خدا بخش نے باز کی آنکھوں پر سے کھوپے اتارنے سے پہلے مجھے غور سے تماشا دیکھنے کی تلقین کی۔ ''یہ تمہاری زندگی کا ایک کبھی نہ بُھولنے والا تجربہ ہوگا۔'' اس نے کہا ''مزہ آ جائے گا۔ جب باز لالی پر جھپٹے گا تو ایسی آواز پیدا ہوگی جیسے ہوا کو تلوار کاٹ رہی ہے۔۔۔۔ دیکھو۔''

خدا بخش نے باز کی آنکھوں پر سے کھوپے اتارے اور اس کا رخ دور ایک ٹیڑھے میڑھے کیکر کی طرف کر دیا جس پر تقدیر نے ایک لالی کو لا بٹھایا تھا۔ ایک دم باز پر جیسے وحشت طاری ہوگئی۔ ''اس نے دیکھ لیا لالی کو۔'' خدا بخش نے خوش ہو کر مجھے بتایا اور بشکو نے باز کے پنجے کو اپنے دستانے سے آزاد کر دیا۔ موت کی تلوار ہوا کو کاٹتی ہوئی چلی گئی اور لالی اُڑ گئی مگر باز نے آن کی آن میں اسے جا لیا۔ لالی کی ایک چیخ نے اس ویرانے کو ذرا سا چونکا دیا اور پھر باز لالی کو اپنے پنجوں میں دبائے واپس بشکو کی مٹھی پر آ بیٹھا۔ تب اس نے لالی کی چیر پھاڑ شروع کر دی۔ اس کی مُڑی ہوئی چونچ لالی کے خون میں رنگ گئی۔ پھر اس نے لالی کی بوٹیاں نوچنا شروع کر دیں اور خدا بخش مسلسل بولتا رہا۔ ''اس کے کھانے کا قرینہ دیکھو، ہڈی پر سے گوشت کیسے اتارتا ہے۔ انسان کو بھی ایسا سلیقہ نصیب نہیں اور پھر یہ تو کچا گوشت ہے۔ تازہ اور وٹامن سے بھرپور۔''

''لعنت!'' میں نے کہا ''تمہاری ذہنیت تو آدم خوروں کی سی ہے۔''

مگر خدا بخش ہنستا رہا اور میری طرف یوں دیکھتا رہا جیسے میں بیمار ہوں اور وہ میری دل آزاری نہیں کرنا چاہتا۔

باز جب لالی کو چبا چکا تو جیسے اسے نشہ ہو گیا۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں اور خدا بخش بولا ''لارنس آف تھلیبیا آؤٹ ہو گیا۔'' پھر ہنستا ہوا وہ گھوڑے پر سوار ہوا۔ باگ موڑی مگر پھر رُک گیا۔ کچھ سوچ کر بولا ''کیوں بشکو یہاں تک پہنچ گئے ہیں تو بابا یارُو کو کیوں نہ دیکھتے چلیں؟''

بشکو بولا ''بابا یارو کی آنکھ بھی باز کی طرح تیز ہے۔ ہو سکتا ہے اس نے ہمیں دیکھ ہی لیا ہو۔ ہم واپس چلے گئے تو وہ ضرور گلہ کرے گا۔''

''ہاں ٹھیک ہے۔'' خدا بخش میری طرف مڑا۔ ''چلو تمہیں تھل کی چائے پلائیں۔ یہاں قریب ہی ہمارے پرانے مزارعے بابا یارو کا ڈیرہ ہے وہاں چلتے ہیں تم اس سے مل کر خوش ہو گے۔''

باز نے جس وحشت سے لالی کو کھایا تھا اس سے میری طبیعت بٹھس ہو رہی تھی۔ میں نے کہا ''جہاں چاہو چلے چلو۔''

ڈھائی تین میل کا فاصلہ طے کر کے ہم سرخی مائل مٹی سے پے ہوئے ایک گھروندے کے پاس پہنچے۔ خدا بخش نے چپکے سے اترنے اور آہستہ آہستہ قریب جانے کی تجویز پیش کی۔ وہ بولا ''بڑا لطف آئے گا۔ ایک بار میں اور بشکو یونہی چپکے سے آئے اور بابا یارو کے پاس ایک چارپائی پر بیٹھ گئے۔ بابا یارُو اپنی رسیاں بٹنے میں مگن رہا۔ مائی بیگاں چولہے میں پھونکیں مارتی رہی اور رنگی ٹوکے سے چارہ کترتی رہی۔ کسی کو پتہ ہی نہ چلا۔ پھر جب انہیں پتہ چلا تو بابا یارُو اتنا شرمندہ ہوا کہ کچھ کہہ ہی نہ سکا۔ منہ سے بس پھپ پھپ کر کے رہ گیا۔ مائی بیگاں اپنے بڑھاپے کو گالیاں دیتی رہی اور رنگی تو اتنا ہنسی کہ جب بابا کی پھٹکار پر بھی اس کی ہنسی نہ رکی تو وہ

اندر کوٹھے میں بھاگ گئی۔''

گھروندے کے پچھواڑے گھوڑوں پر سے اُتر کر ہم آہستہ آہستہ آگے بڑھے۔ صحن میں کیکر کے بڑے بڑے درخت تھے۔ نیچے ایک گائے اور چند بھیڑ بکریاں شاید عادتاً بیٹھی تھیں کیونکہ درختوں کے سائے اپنے تنوں کے سائے سے بہت دور ہو چکے تھے۔ ان بھیڑوں بکریوں کے پاس کھٹولے پر بابا یارو بیٹھا اون بٹ رہا تھا۔ دیوار کے ساتھ لگے ہوئے چولہے میں آگ جل رہی تھی اور مائی بیگاں ہانڈی میں چمچہ چلا رہی تھی جیسے پتھر ابال رہی ہو۔ دونوں اپنے اپنے کام میں ایسے محو تھے کہ انہیں ہمارے آنے کا پتہ نہ چلا۔ پھر اچانک مائی بیگاں بولی ''ہائے مجھے تو بہت چٹنا لگ رہی ہے۔ رنگی کو اب تک تو آ جانا چاہیے تھا۔''

''آ جائے گی۔'' بابا یارو بولا ''کہاں گئی ہے؟ اپنے ملکوں کے ہاں گئی ہے نا؟ تو پھر اپنے ہی گھر گئی ہے۔ جانتی نہیں ہو ملک کی بیٹی اس کی کتنی پکی سہیلی ہے؟ وہ دوپٹہ یاد ہے جو اس نے پچھلی گرمیوں میں رنگی کو دیا تھا؟ اتنا بڑھیا ریشم تھا کہ رنگی اسے تہہ کرتی گئی اور آخر وہ اتنا سا رہ گیا کہ تمہارے چمٹے کے چھلے میں آ گیا۔ سو روپے کا ہو گا یہ دوپٹہ۔ وہ اپنی اتنی پیاری سہیلی کے پاس گئی ہے تو فکر کی کون سے بات ہے۔ رات بھی رہ لے تو سمجھو فرشتوں کے گھر مہمان ہے۔''

خدا بخش نے آہستہ سے کہا ''میرے خیال میں واپس چلنا چاہیے۔ ان بے چاروں نے ہمیں دیکھ لیا تو خاطر مدارات میں لگ جائیں گے۔''

بشکو بولا ''اور پھر چائے پکانا تو مائی کو آتا ہی نہیں، جوشاندہ گھولتی ہے۔ رنگی ہوتی تو پی لیتے۔ ایسی چائے پکاتی ہے کہ نشہ ہو جاتا ہے۔''

خدا بخش بے اختیار ہنس پڑا تو مائی اور بابا نے چونک کر دیکھا اور ان کے ہاتھ پیر پھول گئے۔ وہ خدا بخش سے رکنے، بیٹھنے اور چائے پینے کی یوں التجائیں کرنے لگے جیسے اگر خدا بخش نے ان کی بات مان لی تو ان کا گھروندا سونے چاندی کے محل میں بدل جائے گا اور ان کی بکریاں

گھوڑیاں بن جائیں گی۔

خدا بخش نے انہیں سمجھایا کہ سورج ڈوبنے کو ہے اور ہم دشمنوں والے لوگ ہیں۔ شام کے بعد تو ہماری حویلی کی فصیل پر رائفل والوں کا پہرہ ہوتا ہے۔ ''تم تو جانتے ہو بابا یارو میں شام سے پہلے گھر نہ پہنچا تو بڑے ملک قیامت مچا دیں گے۔ ہمارا باز لالی کا شکار کرنے آیا تھا۔ سوچا تمہیں دیکھتے چلیں۔ ٹھیک ہونا؟ کوئی تکلیف تو نہیں؟ اچھا اب تم بیٹھو، ہم چلے۔'' رکاب میں پاؤں رکھتے ہوئے خدا بخش بولا۔ ''رنگی کی فکر نہ کرو اگر اسے دیر ہوگئی تو میری بہن اسے روک لے گی۔۔۔۔ اور اب تو دیر ہو ہی چکی ہے۔''

بابا یارو بولا ''آج صبح اسے ایک جھاڑی کی جڑ میں اُگی ہوئی بہت سی چُونگیں ملی ہیں۔ اس کی سہیلی کو چُونگیں بہت پسند ہیں اس لیے رٹ لگا دی کہ وہ ملکوں کی حویلی میں جائے گی۔ کپڑے دھوئے، سکھا کر پہنے اور دوپہر کو چُونگوں کی پوٹلی باندھ کر چلی گئی۔ ویسے تو وہ سیانی ہے پر سوچتا ہوں اگر راستے میں شام پڑ گئی تو۔۔۔۔ ویرانہ ہے ڈر لگتا ہے۔''

خدا بخش نے تسلی دی۔ ''ہماری زمینوں پر ایک چڑیا تک کو خطرہ نہیں تو رنگی کو کیا ڈر ہے۔ سب جانتے ہیں کہ رنگی بابا یارو کی بیٹی ہے اور سب جانتے ہیں کہ بابا یارو کس کا آدمی ہے۔۔۔۔ تم فکر نہ کرو، لو ہم چلے۔''

واپسی پر خدا بخش نے بازوں اور شکروں کے سلسلے میں بے حساب معلومات سے مجھے لاد ڈالا۔ میرے ذوق کی رعایت سے اس نے خوشحال خاں خٹک اور علامہ اقبال کے شاہینوں کا بھی ذکر کیا اور بعض پرانے بادشاہوں کے سکوں، تلواروں کے قبضوں اور لبادوں کے بٹنوں پر بازوں کی تصویروں کے بارے میں بتا کر ثابت کیا کہ باز ایک ہی شاہی پرندہ ہے۔ آخر میں اس نے یہ مسکت دلیل دی ''تم نے آج تک کبھی نہیں سنا ہوگا کہ کسی غریب آدمی نے باز پالا ہو!''

''غریب آدمی تو لالیاں پالتے ہیں۔'' میں نے کہا۔

خدا بخش میرے طنز کا کچھ جواب دینے ہی لگا تھا کہ اس نے اپنے گھوڑے کی لگام کھینچ لی۔ کیکروں کے ذخیرے کے موڑ پر یکا یک ایک نوجوان لڑکی ہمارے سامنے آئی۔۔۔۔ وہ رنگی تھی۔ نہ جانے اس کا اصل نام کیا تھا مگر مجھے ایسا معلوم ہوا کہ جیسے وہ رنگوں کا ایک پیکر ہے۔۔۔۔ سات رنگوں میں سے کوئی بھی رنگ ایسا نہ تھا جس سے اس کا وجود محروم ہو۔ اس کی آنکھوں، بالوں، چہرے اور ہونٹوں سے جو رنگ بچ رہے تھے وہ اس کے تہہ بند، کُرتے اور اوڑھنی میں جذب ہو گئے تھے۔ اس وقت سورج سپاٹ میدان کے پرلے کنارے پر ٹھوڑی ٹیکے جیسے زمین کا آخری نظارہ کر رہا تھا۔ آسمان کے وسط میں بادل کے چند ٹکڑے ابھی سے گلابی ہو گئے تھے اور گلاب کیکروں کے ذخیرے کے اس موڑ پر برس پڑا تھا۔ اگر ایک بے رنگ چپلی سے نکلے ہوئے رنگی کے پاؤں کے ناخن ٹوٹے ہوئے نہ ہوتے تو اسے زمینی مخلوق قرار دینے کے لیے مجھے اپنے آپ سے خاصی طویل جنگ لڑنی پڑتی۔ مجھے ایسا لگا کہ کٹر سے کٹر ملحد کو بھی رنگی کی ایک جھلک دکھا کر اسے ایک ایسے خدا کا قائل کیا جا سکتا ہے جو اس انتہا کا حُسن کار ہے۔

یہ سب کچھ میں نے ایک لمحے میں سوچا جس میں بس اتنا ہوا کہ خدا بخش نے گھوڑے کی لگام کھینچی۔ رنگی ٹھٹھک کر کھڑی ہوگئی اور بشکو پیچھے سے بھاگتا ہوا آیا اور بولا۔

''دیکھا چھوٹے ملک؟ رنگی کتنی بے وقوف ہے۔ اری یہ بھی کوئی وقت ہے اتنے لمبے سفر کا؟ تجھے ملکانی نے روکا نہیں۔۔۔۔؟''

''چل واپس۔۔۔۔'' خدا بخش نے بڑی اپنائیت سے حکم دیا۔ ''جو ہمارے دشمن ہیں وہ ہمارے مزارعوں کے بھی دشمن ہیں اور ہمارے دشمن بے شمار ہیں۔ سورج ڈوب رہا ہے۔ چاند کی رات بھی نہیں ہے۔ اتنا لمبا ویران راستہ ہے اور چل کھڑی ہوئی ہے اس وقت۔ چل واپس۔ میں جا کر اپنی بہن کی خبر لیتا ہوں کہ ایسا سلوک کیا جاتا ہے اپنی سہیلی سے۔ غریب سہی پر کیا انسان نہیں

ہے رنگی؟۔۔۔۔چل رنگی۔''

رنگی صرف دو لفظ بولی مگر انہوں نے اس کے حُسن میں جیسے ایک چھنا کا سا پیدا کر دیا۔

''بابا بے چارہ۔۔۔۔''

''ہم سمجھا آئے ہیں بابا کو۔۔۔۔'' خدا بخش فوراً بولا۔''ہم نے کہہ دیا تھا کہ اگر رنگی ہمیں گاؤں کے پاس مل گئی تو ہم اسے واپس حویلی میں لے جائیں گے۔ ایسے وقت ویرانوں میں نہیں نکلتے نادان! زمانہ بڑا خراب ہے۔ چل۔''

رنگی ہمارے ساتھ چل پڑی۔ گاؤں میں پہنچ کر وہ بشکو کے ساتھ حویلی کی طرف چلی گئی اور ہم چوپال پر آ گئے۔ رات کے کھانے کے بعد بڑے ملک صاحب نے مجھ سے باز کے شکار کا پوچھا اور پھر کافی دیر تک بازوں، شکروں، کُتوں اور گھوڑوں کی باتیں کرتے رہے۔ میں نے خدا بخش سے سرگوشی کی۔''تمہارے ہاں شکروں اور کتوں ہی کی باتیں ہوتی ہیں؟ انسانوں کی نہیں ہوتیں؟''

''ارے چپکے رہو'' اس نے آہستہ سے کہا''ورنہ ابا پکڑ کر سکین بنا ڈالیں گے۔''

بڑے ملک اُٹھ کر چلے گئے تو چھوٹے ملک کی گپوں کی باری آئی۔ وہ بیشتر وقت اپنے لارنس آف تھلیبیا کی تعریف کرتا رہا۔۔۔۔ ایک بار بشکو نے آکر اس سے کوئی بات کی اور وہ رکا تو سننے والوں کو داد و تحسین کا موقع ملا'' بابا رحمٰن کہتا ہے کہ وہ ایک صدی کا ہو رہا ہے مگر آج تک اُس نے اِس بلا کا باز نہیں دیکھا۔ وہ کہتا ہے چھوٹے ملک کا باز، بازوں کا شیر ببر ہے۔''

جب خدا بخش بھی حویلی میں چلا گیا اور بشکو بھی میرا بستر جما کر اور تپائی پر پانی کا ایک جگ رکھ کر روانہ ہو گیا تو میں اپنے پلنگ پر لیٹ گیا۔ آسمان اتنا صاف تھا کہ سیاہ ہو رہا تھا۔ تارے اتنے بے شمار تھے کہ ان کی طرف دیکھتے ہوئے سر چکرا جاتا تھا۔ گاؤں پر مکمل سناٹا تھا۔ رات کا

آغاز تھا اس لیے کُتے تک سو گئے تھے۔ صرف جھینگر جاگ رہے تھے مگر جھینگروں کی آواز بھی تو سناٹے کا ایک حصہ ہی ہوتی ہے۔

تب رنگی کا پیکر میرے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا۔ اس تناؤ اور اعتماد کے ساتھ جیسے وہ کہہ رہی ہے کہ کوئی نقص ڈھونڈ سکتے ہو تو ڈھونڈو۔۔۔۔ میں نے رنگی کے اس پیکر کو، جسے میں نے شام کے ایک گلابی لمحے میں اپنے ذہن کے اندر محفوظ کر لیا تھا، ہر زاویے سے جانچا اور تب میں نے کہا۔۔۔۔''ہاں رنگی! تم میں ایک نقص تو موجود ہے اور وہ نقص ہے کہ تم انسان ہو اور انسان بڑی کمزور مخلوق ہے۔''

چوپال کے زیریں آنگن میں کیکر پر چڑیوں نے واویلا مچایا تو میری آنکھ کھلی۔ قریب ہی مسجد میں فجر کی نماز ادا کی جانے والی تھی اور کوئی اونچی آواز میں تکبیر پڑھ رہا تھا۔ ''قد قامت الصلوۃ، قد قامت الصلوۃ!'' صبح کے ہلکے ہلکے اجالے میں مسجد کے مینار آسمان کے پس منظر میں متحرک معلوم ہو رہے تھے۔ پھر ایک مینار کے کلس پر ایک چیل اتری اور اسے اپنا توازن قائم رکھنے کے لیے دیر تک پروں کو بار بار پھیلانا پڑا۔ اس پر بھی جب ٹِک کر نہ بیٹھ سکی تو اُڑ گئی۔ منہ اندھیرے یہ چیل کہاں سے آ گئی؟ میں نے سوچا۔ پھر میں نے خود کو جواب دیا۔''جہاں سے یہ چڑیاں آئی ہیں۔''

سورج ابھی نہیں نکلا تھا جب بشکو میرے لیے ملائی سے اٹا ہوا دودھ کا ایک گلاس لایا۔ غسل خانے میں منہ پر پانی کا ایک چھینٹا مار کر میں باہر آیا تو خدا بخش چوپال کی سیڑھیاں چڑھ رہا تھا۔ چلو ذرا ذخیرے تک گھوم آئیں۔ اس نے کہا'' وعدہ کہ آج میں تم سے انسانوں کی باتیں کروں گا۔''

''چلو۔۔۔۔'' میں نے کہا۔ پھر میں سیڑھیوں پر رُک گیا۔۔۔۔''سنو کیا رنگی چلی گئی؟'' دفعتاً خدا بخش کو اس زور کی ہنسی چھوٹی کہ وہ ہنستا ہنستا میرے پلنگ پر جا گرا۔'' آخر کار پتھر

میں بھی جونک لگی تو۔'' قہقہوں کے دوران وہ اپنی رانوں کو پیٹ پیٹ کر کہتا رہا۔۔۔۔''برف کی تہہ بہت موٹی تھی مگر آخر ٹوٹی تو۔۔۔۔۔'' پھر وہ مجھ سے لپٹ گیا۔''یار! مجھے تم پر ایک دم بہت سا پیار آ گیا ہے۔ میں سمجھتا تھا تم اُلو کے الو ہی ہو۔۔۔۔'' بڑی مشکل سے سانسوں پر قابو پانے کے بعد وہ بولا''رنگی یونہی کیسے جا سکتی ہے؟ لسی پیے گی، پراٹھا کھائے گی۔ اس کی سہیلی اسے یونہی آسانی سے تھوڑی جانے دے گی۔ اماں بیمار نہ ہوتی تو رنگی کو میری بہن اپنے کمرے میں سلاتی۔ ابھی تو وہ اٹھی بھی نہ ہوگی۔'' پھر ذرا سا رُک کر بولا۔'' جانے لگی تو تمہیں دکھائیں گے، بلکہ آج شام کی چائے وہیں بابا یارو کے ہاں کیوں نہ پئیں؟''

''چھوٹے ملک!'' بشکو چلّایا اور اتنی تیزی سے بھاگتا ہوا آیا کہ کیکر پر سے سب چڑیاں ایک ساتھ اُڑ گئیں۔

''کیا ہے؟ اماں تو ٹھیک ہیں؟'' خدا بخش نے گھبرا کر پوچھا۔

''جی وہ تو ٹھیک ہیں۔۔۔۔۔ پر۔۔۔۔'' بشکو کی آنکھیں پھٹی پڑ رہی تھیں، نتھنے پُھول رہے تھے اور منہ مسلسل کُھلا تھا۔

''پر کیا؟۔۔۔۔ کچھ بکو'' خدا بخش نے اسے ڈانٹا۔

اور بشکو نے جیسے کائنات کے سب سے بڑے حادثے کی اطلاع دی۔

''کسی نے آپ کے لارنس کی گردن مروڑ کر پھینک دی ہے۔ لارنس مرا پڑا ہے۔''

خدا بخش کو جیسے سکتہ ہو گیا۔ ایک خاصے طویل وقفے کے بعد وہ بولا''رنگی کو یہاں لے آؤ''

بشکو واپس بھاگا تو میں نے خدا بخش سے پوچھا''رنگی کو بلانے کا کیا مطلب ہے؟''

''ہے ایک مطلب۔'' خدا بخش بولا۔ حادثہ شدید تھا اس لیے میں خاموش رہا۔

فوراً بعد بشکو آیا۔''رنگی منہ اندھیرے ہی چلی گئی چھوٹے ملک۔''

اور خدا بخش اپنی لہولہان آنکھیں مجھ پر گاڑ کر بولا''دیکھا؟ میں نہ کہتا تھا میرے باز کو اسی

کمینی نے مارا ہے۔ رات وہ بار بار یہی کہتی تھی کہ وہ مجھے مار ڈالے گی۔۔۔۔۔ میں نے کہا''لالیاں بازوں کو نہیں مار سکتیں نادان۔۔۔۔۔'' اُسی نے مارا ہے میرے لارنس کو۔۔۔۔ میں جانتا ہوں یہ قتل اُسی بدذات کنگلی، قلاش لڑکی نے کیا ہے میں اس کی کھال اُدھیڑ دوں گا۔ میں اُس کی۔۔۔۔۔''

(''کپاس کا پُھول'')